حج'' کے بجائے ''شائقین ریاکاری'' قرار دینا چاہیے جو طوافِ کعبہ، رکن یمانی، حجرِ اسود، حطیم کعبہ، ملتزم اور مقام ابراہیم علیہ السلام وغیرہ پر بھی اتنے رش کے باوجود فوٹوگرافی کے شوق کو اولیت دیتے رہتے ہیں۔

حدودِ حرم میں گناہ کی شدت

فوٹوگرافی کے شوقین لوگ مسجد الحرام میں جس قدر خطرناک گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، غالباً بیچاروں کو اس کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جس چیز کو حرام قرار دیا، جس پر روزِ قیامت شدید ترین عذاب کی وعید سنائی، جس گناہ پر لعنت فرمائی' اس کا ارتکاب کسی بھی جگہ انتہائی حرام ہے۔ پھر حدودِ حرم میں گناہ کا ارتکاب کرنا تو درکنار، اس میں گناہ کا صرف ''ارادہ کرنا'' بھی موجب عذابِ الٰہی ہے:

﴿وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝﴾ [الحج ٢٥] ''اور جو کوئی اس (حرم) میں الحاد و لادینی کے ساتھ ظلم کا ارادہ کرے ہم اسے دردناک عذاب میں مبتلا کریں گے۔''

حرمت مدینہ شریف

بہت سے لوگوں کو علم نہیں ہے کہ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ شریف بھی ''حرم'' ہے۔ اور حدودِ حرم میں بدعت یا گناہ کے ارتکاب کی سزا نہایت شدید ہے۔ فرمانِ نبوی ہے: **''المدينةُ حرمٌ ما بين عائرٍ إلى كذا، مَن أحدثَ فيها حَدَثًا أو آوىٰ مُحدِثًا فعليهِ لعنةُ الله والملائكةِ والناسِ أجمعينَ، لا يُقبَلُ منهُ يومَ القيامةِ صرفٌ ولا عدلٌ''**[البخاري ١٨٧٠، ١٣٧٢، ٧٣٠٠، مسلم ٤٦٧ (١٣٧٠) عن علي رضي الله عنه] ''مدینہ شریف کوہ عائر (عیر) سے وہاں تک حرم ہے، جو کوئی اس حدودِ حرم میں کوئی بدعت یا جرم کرے یا کسی بدعتی یا مجرم کو پناہ دے، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی طرف سے لعنت ہے۔ روزِ قیامت اس سے کوئی فرض و نفل عبادت یا بدلہ وفدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔''

اس فتنے کا دوسرا خطرناک پہلو یہ ہے کہ بعض سکالر ٹائپ علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین کیمرے کی تصویر پر جواز کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ اللہ جانے یہ ان بیچاروں کی سادہ لوحی کا مظہر ہے یا رنگین مزاجی کا نتیجہ!

بہر حال اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے حرمت کے دلائل کی روشنی میں اہل اسلام کو زندگی بھر عموماً اور دورانِ عبادت خصوصاً تصویر کشی سے باز رہنا چاہیے۔

درس قرآن مجید

تراث رحمانی درفوائد قرآنی

ڈاکٹر محمد اسماعیل امین

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾[البقرۃ: ۸۰-۸۲]

ترجمہ: ''اور انہوں نے کہا ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی، مگر گنے ہوئے چند ایام، آپ کہہ دیجیے کیا تم نے اللہ کے پاس کوئی عہد لے رکھا ہے پس اللہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے!؟ کیوں نہیں، جس نے بڑی برائی کمائی اور اسے اس کے گناہ نے گھیر لیا تو وہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

سابقہ آیات سے ربط اور مختصر تفسیر:

سابقہ آیتوں میں اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کے مختلف طبقوں کی سرکشیوں کا تذکرہ فرمایا۔ ان کے علمائے سوء کے خطرناک جرائم اور ان کے منافقین کی بدترین سازشوں اور ان کے عوام الناس کے جاہلانہ رویوں کا ذکر فرمایا۔

زیر تفسیر آیتوں میں انہی یہود کے تمام طبقوں (علمائے سوء، منافقین اور عوام) کی گمراہی کے اصل سبب کا بیان ہے۔ اور اسی بات میں ان کی ہمہ گیر گمراہی مضمر ہے، وہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے محبوب اور پیارے ہیں، ہم چاہے کتنے بھی گناہ کریں جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے، اگر ڈالے بھی گئے تو چند دن وہاں رکھ کر نکال لیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان کے اس زعم باطل کی خوب تردید فرمائی، پھر جہنم سے نجات اور جنت میں داخلے کا اللہ تعالیٰ کے ہاں سب کے لیے یکساں، مساویانہ اور منصفانہ اصول واضح فرمایا: ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾

ان آیات کے سبب نزول کے بارے میں دو روایات وارد ہوئی ہیں:

(۱): حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں سے کئی سوالات کیے، ان میں سے ایک یہ تھا: مَن أهلُ النارِ؟ (آگ میں رہنے والے کون ہیں؟) انہوں نے کہا: ہم اس میں تھوڑی دیر رہیں گے، پھر تم اس میں ہماری جگہ لیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اِخسَئُوا فیها، واللهِ لا نخلفكم فيها أبدًا'' (تم ہی اس میں ذلیل ہوکر رہو گے۔ اللہ کی قسم ہم اس میں کبھی تمہاری جگہ نہیں رہیں گے۔) [صحيح البخاري ۳۱٦۹] تفسیر طبریؒ کے مطابق حضرت عکرمہؒ نے کہا: اسی واقعے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲): حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی کہا کرتے تھے کہ دنیا کی مدت صرف سات ہزار سال ہے، اور لوگوں کو دنیا کے ایک ہزار سال کے بدلے آخرت کے ایک دن کا عذاب ہوگا۔ تو یہ صرف سات دن ہیں۔ دوسری روایت کے مطابق: ہم یہود کو صرف سات دن عذاب ہوگا، پھر عذاب ختم ہو جائے گا۔ [تفسير ابن أبي حاتم وحسنه الحافظ في الفتح ۱۰/۳۰٤]

تمسَّ فعل مضارع منصوب اور نَا جمع متکلم مفعول ہے، النارُ فاعل مؤخر ہے۔ اور اس سے مراد نارِ آخرت ہے۔ معدودةً: عَدَّ يَعُدُّ (گننا) سے گنتی کے چند دن۔ یہود کہتے تھے کہ ہم جہنم میں گئے بھی تو چند دن رہیں گے۔ اس مقدار کے بارے میں علمائے تفسیر کے دو اقوال ہیں:

(۱) چالیس دن مراد ہے۔ اس مدت کی تحدید کی کئی وجوہات وارد ہوئی ہیں:

(الف) جہنم کے دونوں کناروں کا فاصلہ چالیس سال کی مسافت ہے۔ اور یہود ایک سال کی مسافت ایک دن میں طے کریں گے۔ جہنم کی تہ میں زقوم کا درخت ہے، وہاں پہنچنے تک عذاب ہوتا رہے گا، پھر جہنم سے نکال دیا جائے گا۔ یہودی وہاں تک چالیس دن میں پہنچ جائیں گے۔ یہ قول عبداللہ بن عباس ؓ سے مروی ہے۔

(ب) کسی معاملے میں اللہ یہود سے ناراض ہوگیا تھا، تو قسم کھا کر فرمایا تھا کہ تمہیں چالیس دن تک عذاب دوں گا۔ اسی قسم کی وجہ سے وہ صرف چالیس دن کے لیے جہنم میں جائیں گے۔ یہ حسن بصریؒ اور ابو العالیہؒ سے مروی ہے۔

(ج) انہوں نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی، اسی لیے وہ چالیس دن کے لیے جہنم میں جائیں گے۔ یہ امام مقاتلؒ سے مروی ہے۔

۲: ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾ سے سات دن مراد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کے نزدیک دنیا کی تمام مدت

ہزار سال ہے۔ اور انہیں ہزار سال کے مقابلے میں ایک دن عذاب ہوگا۔ یہ بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ان کی یہ باتیں صرف دعوی پر مبنی تھیں، ان پر کوئی دلیل نہیں تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی خوب تردید فرمائی۔

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ قُلْ امر ہے، جس کا خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے۔ اَتَّخَذْتُمْ میں ہمزہ استفہام انکاری ہے، اور اتَّخذَ يَتَّخِذُ کا ہمزہ وصل محذوف ہے۔ العهد پختہ وعدے کو کہا جاتا ہے۔ اور عهدًا نکرہ ہے۔

﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾ ف حرف عطف ہے۔ لَن ہمیشہ کے لیے نفی کا معنی دینے والا حرف ناصبہ ہے۔ يُخلِفَ: أخلفَ يُخلِفُ إخلافًا وعدہ کی خلاف ورزی کرنے کو کہتے ہیں۔

اصل میں اللہ پاک نے لوگوں کو نجات عطا فرمانے کے لیے جو وعدہ فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ جو بھی اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور کفر و شرک سے پرہیز کرتے ہوئے عمل صالح انجام دے، اسے جہنم سے نجات ملے گی۔

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

أم کی دو قسمیں ہیں: (۱) أمْ متصلة (۲) أم منقطعة ان دونوں میں دو طرح کا فرق ہے:

(الف) أم متصله "أو" کے معنی میں اور أم منقطعه "بل" کے معنی میں آتا ہے۔

(ب) أم متصله کے مابعد کا اس کے ماقبل سے تعلق ہوتا ہے، اور أم منقطعه کے مابعد اور ماقبل میں تعلق نہیں ہوتا۔

قرآن مجید میں أم متصله کی مثال: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ أم منقطعه کی مثال: ﴿اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝﴾ یعنی: بَل هم قوم طاغون.

زیر تفسیر آیت میں أم کی دونوں قسموں کا احتمال ہے۔ أم منقطعه ہونے کی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا: بل تقولون علی الله ما لا تعلمون. اور أم متصله ہونے کی صورت معنی یہ ہے: کیا تم لوگوں نے اللہ پاک سے وعدہ لے رکھا ہے. یا تم اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے؟

اللہ رب العزت نے یہود کے مزعومہ دعوے کی تردید میں عام منصفانہ اصول بیان فرمایا، جس میں اہل کتاب سمیت سارے مکلفین شامل ہیں: ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ بَلٰى بَلْ کی طرح حرف استدراک ہے۔ امام طبریؒ کہتے ہیں: بَلٰى اصل میں بَل ہی تھا، اس کے

آخر میں یاء کا اضافہ کیا گیا، تاکہ اس پر وقف کرنا درست ہو۔ بلٰی اور بَل دونوں حرف استدراک ہیں، جو سابقہ خبر کی نفی اور آنے والے خبر کے اثبات کا معنی دیتا ہے۔ شیخ ابن العثیمینؒ نے مفسرین سے نقل کیا ہے کہ بَلٰی یہاں پر إضراب انتقالي یا إضراب إبطالي یعنی ان کے سابقہ نظریہ: ﴿لَنْ تمسَّنَا النارُ.....﴾ کو باطل قرار دینے کے لیے آیا ہے۔

﴿ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ ﴾ مَن: اسم موصول بھی ہوسکتا ہے۔ مَن مبتدا اور اس کی خبر آیت کریمہ کا آخری حصہ ہے: فأولٰئک أصحاب النار اور یہ مَن شرطیہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں فاولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ جوابِ شرط ہوگا۔ یہی صورت راجح ہے، اسی لیے فاولٰئکَ جواب میں فاء لایا ہے۔

الکسب کے معنی ہیں کسی عمل کے نتیجے میں کوئی چیز حاصل ہونا یعنی کمانا۔ سَيِّئَةً: ساءَ يَسُوءُ سُوءً اکا اطلاق ہر شر، فتنہ اور برائی پر ہوتا ہے، لیکن آیت کریمہ کے سیاق سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں شرک اور کفر مراد ہے۔ کیونکہ آیت کا سیاق یہود کے بارے میں ہے جو کفر وشرک کے مرتکب تھے۔ یہی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے۔

اَحاطَت کا فاعل خطیئة ہے، اور بہ کی ضمیر کا مرجع مَن کسبَ یعنی گناہ کمانے والا ہے۔ أحاطت: حائط سے ہے، جو دیوار کو کہا جاتا ہے۔ جس طرح چار دیواری ہر طرف سے گھیر لیتی ہے، اسی طرح اس شخص کو گناہوں نے گھیر لیا۔ الإحاطة لغت میں شمول یعنی گھیرنا اور شامل ہونا ہے۔

خطيئة سے مراد بھی کفر وشرک ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جس نے تمہارے جیسے اعمال کیے اور تمہاری طرح کفر کیا، حتی کہ اس کے کفر نے اس کی تمام نیکیوں کو گھیر لیا۔ [ابن أبي حاتم بسند حسن]

﴿وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ﴾ کی تفسیر میں سلف صالحینؒ سے منقول تفاسیر کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱: جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر وشرک کرے، اور بہت سے گناہوں کا مرتکب ہونے کے بعد بغیر توبہ کے مر جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ کیونکہ اہل سنت والجماعت کے ہاں کتاب الٰہی وسنت نبویہ سے مستنبط نظریہ ہے کہ صرف مشرک وکافر ہی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

۲: ہر وہ گناہ اس کے مفہوم میں شامل ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے آگ واجب کی ہو۔ ۳: کبیرہ گناہ کے مرتکب بھی اس میں داخل ہیں۔ ۴: ہر وہ گناہ جو اپنے مرتکب کو گھیر لینے والا ہو، وہ خطیئة ہے۔

شیخ ابن العثیمینؒ کہتے ہیں: سيئة و خطيئة ایک قول کے مطابق مترادف ہیں۔ یہ بڑھتا جاتا ہے، حتی کہ اسے

گھیرے ہوئے ہیں۔

جبکہ مشہور قول کے مطابق السیئۃ سے مراد کفر ہے اور خطیئۃ سے مراد کفر سے کمتر درجے کے گناہ ہیں۔

ایک قراءۃ کے مطابق خطیناتہ جمع وارد ہوئی ہے، لیکن خطیئۃ بھی جمع کے معنی میں ہے، کیونکہ نکرہ مفرد جب ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے، تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ جمع میں گناہ کے انواع کی طرف اشارہ ہے۔

﴿ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ﴾ میں أولئک اسم اشارہ ہے۔ أصحاب النار سے مراد أهل النار ہے۔ أصحاب صَحْب کی جمع ہے۔ یعنی ساتھی، کیونکہ وہ جہنم کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے۔ العیاذ باللہ

امام طبریؒ نے کہا کہ انہیں أصحاب اس لیے کہا گیا کہ انہوں نے ان اعمال کو ترجیح دی، جو انہیں جہنم میں پہنچانے والے تھے، اور جنت میں لے کر جانے والے اعمال کو ترک کیا۔ جیسے کوئی آدمی اپنے دوست کی صحبت کو دوسروں کی صحبت پر ترجیح دے، یہاں تک وہ اسی شخص کی صحبت سے معروف ہو جائے تو کہا جاتا ہے: صاحبُ فلانٍ یعنی فلان کا ساتھی۔ اسی طرح جہنمیوں کے برے اعمال کو جنت میں لے جانے والے اعمال پر ترجیح دینے کی وجہ سے انہیں أصحاب النار کہا گیا۔

﴿ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ﴾ خَلَدَ يَخْلُدُ خُلُودًا بمعنی المکث: ٹھہرنے اور ہمیشہ رہنے کے معنی میں آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کفر و شرک اور نافرمانوں کی مذموم صفات کے ساتھ انہیں جہنم کی وعید سنائی تو ساتھ ہی ان کے برعکس اہل ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری اور جہنم سے نجات کی نوید بھی سنائی: ﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ﴾ یہاں الذین امنوا وعملوا مبتدا ہے أولئک أصحاب الجنۃ خبر ہے۔

الذین امنوا وعملوا الصالحات کی تفسیر سہ ماہی مجلّہ التراث 12/12 میں گزر چکی ہے۔

''جنہوں نے ایمان لایا'' سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور ''ایمان'' صرف تصدیق کا نام نہیں، بلکہ تصدیق کے ساتھ اقرار اور عملی طور پر قبول کرنا بھی شامل ہے۔ اور اس کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا ضروری ہے۔

چونکہ یہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا تذکرہ آیا ہے، اس لیے ایمان سے مراد نظریاتی اور عقائدی امور ہیں،

جیسا کہ اللہ پاک، فرشتوں، رسولوں، آسمانی کتابوں، روز آخرت اور تقدیر پر ایمان لانا۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ میں الصالحات الصالحة کی جمع اور موصوف محذوف کی صفت ہے۔ تقدیرا: عملوا الأعمالَ الصالحاتِ ہے۔ ''عمل'' قول کی ضد نہیں ہے، قول کا ضد ''فعل'' ہے۔ اور ''عمل'' قول وفعل دونوں کا نام ہے، کیونکہ قول عمل اللسان کو کہا جاتا ہے، اور فعل عمل الجوارح کو۔

آیت کریمہ کے سیاق کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: یہاں اللہ تعالیٰ یہود پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن باتوں سے تم نے کفر کیا' اس پر جو ایمان لائے؛ اور جن نیک اعمال کو تم نے ترک کیا' انہیں جو انجام دیں، وہی لوگ جنت میں جائیں گے۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کو خبر دے رہے ہیں کہ یہ لوگ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور برے لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

جنت میں ہمیشہ رہنے کی وجہ سے انہیں أصحاب الجنة کہا گیا ہے۔ اور ''جنت'' وہ عظیم مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان وتقویٰ کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ اس کا نقشہ اللہ کے نبی ﷺ نے یوں کھینچا ہے: ''فيها ما لا عينٌ رأتْ ولا أذنٌ سمعتْ ولا خطرَ على قلبِ بشرٍ'' اللہ تعالیٰ نے اس میں اس طرح کی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی بشر کے تصور میں کبھی آیا ہے۔ [ملخص از تفاسیر: الطبري، القرطبي، البغوي، الشوكاني، ابن كثير، السعدي، ابن العثيمين]

آیات مبارکہ سے مستنبط فوائد

فائدہ 1: ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود دیگر آسمانی مذاہب کی طرح آخرت کو مانتے تھے۔ لیکن یہ اقرار انہیں فائدہ نہیں دے گا؛ کیونکہ وہ آخری نبی ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں، اس لیے وہ مؤمن نہیں ہو سکتے۔ [ابن العثیمین]

فائدہ 2: ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ سے امام قرطبیؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے ایک فقہی استدلال کی تردید کی ہے۔ کہتے ہیں: احناف نے مستحاضہ کے لیے فرمان نبوی ''دعي الصلاةَ أيامَ أقرائكِ'' سے مدتِ حیض تین سے دس دنوں کا استدلال کیا ہے، کہ ''ایام'' تین سے دس دنوں پر بولا جاتا ہے، ایک دو دنوں کے لیے یوم، یومان کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ﴾، ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ

وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ ﴾ دس سے زیادہ دنوں کے لیے أحدَ عشرَ یومًا استعمال ہوتا ہے، أیام نہیں آتا۔

امام قرطبیؒ کہتے ہیں: یہ استدلال درست نہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی فرضیت کے لیے ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ فرمایا ہے، اس سے مراد انتیس یا تیس دن ہیں۔ اسی طرح زیر تفسیر آیت سے سلف کی ایک مشہور تفسیر کے مطابق چالیس دن مراد ہیں۔ پھر ایک لغوی قاعدے کے مطابق أیـــام کی اضافت کسی عارضی چیز کی طرف ہو تو عدد کی تحدید مقصود نہیں ہوتی۔ اگر کہا جائے: أیامَ سفرِکَ تو بیس، تیس یا کم وبیش ایام بھی مقصود ہو سکتے ہیں۔

پھر امام قرطبیؒ نے احناف کی اس رائے کی تخریج کرتے ہوئے یہ توجیہ بیان کی: شاید امام صاحب نے غالب عادات کے مطابق یہ تحدید کی ہوگی کیونکہ اکثر خواتین کی مدت حیض چھ سات دن ہوتی ہے، اسی تناسب سے انہوں نے کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس دن مقرر کی ہوگی۔

فائدہ 3: یہود کا صرف چند ایام کے لیے جہنم میں جانے کا دعوی جہالت کی بنیاد پر ہو سکتا ہے یا انہوں نے عمداً جھوٹ بولا ہے۔ دوسرا احتمال اقرب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید میں فرمایا: ﴿ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ ﴾ [ابن العثیمین] یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے تم سے کوئی خاص عہد نہیں کیا، تو اس طرح یہ دعوی افتراء علی اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس اسلوب رد میں یہود کی بہت سخت ڈانٹ اور سرزنش ہے۔ [القرطبي ، القاسمي]

یہود کا دعوی تھا کہ ہم جہنم میں صرف چند ایام رہیں گے، اس کی وجہ میں بعض علماء نے بیان کیا کہ ان کا دعوی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے انکار نبوتِ عیسیٰ علیہ السلام اور رسالتِ محمد ﷺ سے وہ کافر نہیں ہوئے۔ اس لیے اگر ان سے کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہو جائے تو وہ فاسق ہوگا، کافر نہیں۔ اور یہ تمام آسمانی کتابوں میں مسلمہ قاعدہ ہے کہ فاسق مسلمان اگر جہنم میں گیا تو بالآخر وہ جہنم سے نکالا جائے گا۔ ان کا یہ دعویٰ بناءُ الفاسدِ علی الفاسدِ ہے، کیونکہ دین موسیٰ علیہ السلام کی ابدیت کا دعوی ہی غلط ہے۔ لہذا انکارِ نبوت مسیحیہ ومحمدیہ کے سبب وہ کافر ہیں۔ اور کفار کا چند روز کے بعد جہنم سے نجات پانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ''عہد'' سے تعبیر فرمائی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ان کا دعوی بلا دلیل بلکہ مخالفِ دلیل ہے۔ [معارف القرآن]

فائدہ 4: ﴿قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ ﴾ قرآن مجید کا اندازِ مناظرہ اور اہل باطل پر اسلوبِ رد انتہائی حسین، خوب صورت، مؤثر، قوی اور منطقی

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوے کو دو صورتوں میں محصور فرمایا کہ تمہارے صرف چند دنوں کے لیے جہنم میں جانے کا دعوی درست یا باطل ہونے کا فیصلہ دو صورتوں میں ہوگا: (۱) اگر اللہ تعالیٰ نے تم سے خاص وعدہ کیا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ (۲) اگر کوئی وعدہ نہیں فرمایا ہے، تو تم اللہ عزوجل پر جھوٹ اور افتراء باندھ رہے ہو۔ جب ان کے ہاں کوئی وعدہ ثابت نہیں ہے، تو ان کا جھوٹ ثابت ہوگیا اور دعوی باطل ہوگیا۔ [ابن العثیمین]

فائدہ 5: ﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾ آیت مبارکہ میں یہود کی ضلالت کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ کفر وشرک کے ساتھ مختلف بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے بھی نہیں تھے۔ بلکہ عذاب وعقابِ الٰہی سے بالکل بے خوف اور مطمئن رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے برائی کے ساتھ عذاب الٰہی سے بے خوف رہنے کے دونوں بڑے جرائم کو جمع کیا۔ [السعدي]

اللہ عزوجل کے عذاب سے بالکل بے خوف ہونا انتہائی نقصان اٹھانے کا پیش خیمہ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ۝﴾ [الأعراف ۹۹]

فائدہ 6: ﴿أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا۔ ''عہد'' کی پاسداری کرنے میں اللہ پاک کی دو عظیم صفاتِ کمال کا اثبات ہے: کمالِ صدق وکمالِ قدرت۔ کیونکہ وعدہ خلافی کرنے والا جھوٹا ہوتا ہے، یا قدرت نہ ہونے کی وجہ سے عاجز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں عیوب سے بالکل پاک ہونے کی وجہ سے اس سے وعدہ خلافی کبھی واقع نہیں ہوتی۔ [ابن العثیمین]

فائدہ 7: ﴿أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ لاعلمی میں کسی بات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا یہود کی ایک مذموم ترین صفت ہے۔ اور یہ بری خصلت انتہائی خطرناک جرائم کی اساس ہے۔ اللہ پاک کے احکام اور شریعت میں لاعلمی سے بات کرنا اور اللہ پاک کی ذات اور اسماء وصفات میں بغیر علم کے بحث اور گفتگو کرنا بھی اللہ کی طرف بغیر علم کے بات کی نسبت کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر کوئی شخص بغیر علم کے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے، یا کسی حکم کو واجب قرار دے، یا اللہ تعالیٰ کے کسی ثابت شدہ نام یا صفت کی نفی کرے، یا کسی غیر ثابت نام اور صفت کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنے کی کوشش کرے، یا کتاب وسنت کے نصوص سے ظاہر مفہوم کو بغیر کسی قرینہ یا دلیل کے غیر ظاہر معنی کی طرف پھیر لے؛ یہ سب صورتیں اللہ پاک پر بلاعلم بات کرنے میں شامل ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ کسی دینی مسئلے میں بغیر علم کے فتویٰ دینا بھی بہت خطرناک جرم ہے۔ اسی لیے مفتی اور عالم دین کو چاہیے کہ اس بارے میں اللہ پاک سے ڈرے اور فتوی دینے سے قبل انتہائی بحث وتحقیق کرے، تاکہ اس سنگین جرم میں پڑنے سے بچ سکے۔ [ابن العثیمین، الجزائري] لیکن بدقسمتی سے دور حاضر کا ایک بڑا فتنہ یہ بھی ہے کہ دینی مسائل میں فتوی دینا عام جاہل اور نیم ملا قسم کے لوگوں کا مشغلہ بنا ہوا ہے۔ العیاذ باللہ

فائدہ 8: زیر تفسیر آیات سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے ذاتی اعمال کا ذمہ دار ہے، اگر اس نے کفر وشرک اور فسق وفجور کا ارتکاب کیا تو اس کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ اور جس نے ایمان صحیح اور عمل صالح کا مبارک راستہ اپنایا، اس کے لیے جنت کی خوش خبری ہے۔ ایک اور جگہ یہود وغیرہ کی غلط فہمی کا رد اس طرح فرمایا: ﴿لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَن يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ○ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ○﴾ [النساء ۱۲۳، ۱۲۴]

یہاں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ کسی نیک بزرگ کی اولاد ہونا یا کسی ولی اللہ کی طرف منسوب ہونا، حتیٰ کہ کسی پیغمبر کی اولاد ہونا بھی باعث نجات نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام جیسے اولوالعزم جلیل القدر نبی نے اپنے نافرمان بیٹے کی عذاب الٰہی سے نجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا کی، تو بارگاہِ ربانی سے جواب ملا: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [ھود ۴۶] ''وہ تیرے اہل میں سے نہیں، کیونکہ اس کا عمل اچھا نہیں ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے اپنی پیاری لخت جگر حضرت فاطمہؓ کو یوں تنبیہ فرمایا: ''يا فاطمة بنت محمد أنقذي نفسك من النار، فإني لا أغني عنك من الله شيئًا'' [البخاري، ابن كثير] ''اے محمد ﷺ کی بیٹ فاطمہؓ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے خود بچالے، اس لیے کہ میں کل تیرے کسی کام نہیں آؤں گا۔'' اور فرمایا: ''مَن بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ'' [صحیح مسلم ۲۶۹۹] ''جس کا عمل اسے پیچھے کردے، اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔''

فائدہ 9: ﴿بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○﴾ اس آیت مبارکہ سے خوارج اور تکفیری نظریہ رکھنے والوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دینے کے لیے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آیت مبارکہ ان کے غلط نظریے کے لیے قطعاً دلیل نہیں بن سکتی،

جس کی وضاحت درج ذیل امور سے ہوتی ہے:

۱: آیت مبارکہ میں "سیئۃ" سے کفر وشرک مراد ہے۔ جیسے کہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے۔ بلکہ امام طبریؒ نے اسی تفسیر پر امت کا اتفاق نقل کیا ہے۔

۲: آیت کریمہ میں اللہ پاک کا فرمان ﴿اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ﴾ اشارہ کرتا ہے کہ اس کی کوئی نیکی باقی نہیں ہے، اس لیے وہ ابدی جہنمی ہے۔ اس سے مراد یہود اور دوسرے کفار ہیں۔ کیونکہ کفر وشرک ہی ایسا گناہ ہے، جو تمام نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کفر کے بارے میں فرمایا: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝﴾ [الفرقان ۲۳] "ہم ان کفار کے اعمال کو بکھرے ہوئے گرد وغبار کی طرح برباد کر دیں گے۔" اور فرمایا: ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ "اگر انبیائے کرام کی اس عظیم جماعت سے بھی شرک سرزد ہوتا تو ضرور ان کے تمام نیک اعمال ضائع ہو جاتے۔" حتی کہ آخری اور افضل ترین رسول ﷺ سے یوں خطاب فرمایا: ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ "اگر بفرضِ محال آپ سے بھی شرک کا ارتکاب ہوتا تو ضرور آپ کے اعمال حسنہ برباد ہو جاتے۔"

۳: آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس میں یہود پر رد ہے۔

۴: قرآن مجید کا نزول ہمارے نبی ﷺ پر ہوا ہے، اس لیے آپ سے بڑھ کر قرآن کا مفہوم سمجھنے والا کوئی نہیں، اور آپ ﷺ سے متواتر روایات وارد ہوئی ہیں کہ جو فاسق وفاجر شخص بھی جہنم میں پہنچا تو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ہی سہی، اپنے عقیدہ توحید اور اصل ایمان کی بدولت آخر کار جہنم سے نکالا جائے گا اور اس کا آخری اور ابدی ٹھکانہ جنت ہوگا۔ اور یہی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ [الطبري، القاسمي، ابن العثيمين]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں بلکہ پورے قرآن مجید میں خوارج وغیرہ کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیت مبارکہ ان کے نظریے کے بطلان پر دلالت کرتی ہے۔ جب بھی اہل باطل کسی آیت یا حدیث سے اپنے غلط نظریات کے لیے استدلال کرتے ہیں، تو اسی دلیل میں ان کے خلاف حجت ضرور ملے گی۔ [السعدي]

البتہ کسی مسلمان کو اہل سنت والجماعت کے اس عقیدے کی آڑ میں گناہوں کے ارتکاب کی جرأت نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ کفر وشرک سے پاکیزگی کے ساتھ ہر قسم کے گناہوں سے بھی اجتناب کرنا ضروری ہے۔ کبیرہ گناہوں پر عذابِ الٰہی کی

شدید ترین وعید تو واضح ہے، پچاس ہزار سالہ روزِ قیامت صغیرہ گناہوں کے بھی ہر ہر ذرہ کا حساب ہوگا۔

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ○ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ○﴾ [الزلزال ۷،۸] ''جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔ اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اسے بھی دیکھ لے گا۔'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''إيّاكم ومحقّراتِ الذنوبِ، فإنّهنّ يجتمعنَ على الرجلِ حتى يُهلِكْنَه'' ''تم حقیر سمجھے جانے والے (صغیرہ) گناہوں سے بچو، کیونکہ جب انسان کے اوپر گناہوں کا ڈھیر ہو جاتا ہے، تو وہ اسے ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے مثال دی کہ ایک بڑی جماعت میدان میں اترتی ہے، جب ان کے کھانے کا وقت ہوتا ہے، تو لکڑیاں جمع کرتے ہیں، ایک آدمی ایک لکڑی لے کر آتا ہے، پھر دوسرا اور تیسرا آدمی۔ غرضیکہ سب ایک ایک لکڑی لے کر آتے ہیں، یہاں تک کہ وہاں لکڑیوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے، پھر وہاں بڑی آگ جلاتے ہیں اور اپنا کھانا پکا لیتے ہیں۔'' [مسند أحمد ۳۸۱۸، ۲۲۸۰۸ وصححه الأرنؤط، سلسلة الأحاديث الصحيحة ۳۱۰۳]

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''إيّاكِ ومحقراتِ الأعمالِ فإنّ لها مِن اللهِ -عزوجلّ- طالبًا'' [ابن ماجه ۴۲۴۳، الدارمي ۲۷۲۶، أحمد ۲۴۴۱۵ وصححه الأرنؤط] ''چھوٹے چھوٹے غلط کاموں سے بھی خوب پرہیز کرو، یقیناً ان کے لیے بھی اللہ عزت اور جلال والے کی طرف سے سوال ہوگا۔''

فائدہ 10: ﴿فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○﴾ سے معلوم ہوا کہ کافر اور مشرک لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔ یہی لوگ ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تین مقامات پر کفار کے جہنم میں ہمیشہ رہنے کی وضاحت میں ''خلود'' کے ساتھ ''تابید'' کی تصریح فرمائی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ○ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ [النساء ۱۶۸، ۱۶۹] ﴿إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ○ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ [الأحزاب ۶۴، ۶۵] ﴿وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ○﴾ [الجن ۲۳]

فائدہ 11: آیت مبارکہ میں اہل جنت کی بنیادی صفت ''ایمان'' قرار دی گئی ہے۔ ایمان سے مراد تمام

عقائدی اور نظریاتی امور ہیں، جن کی اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ نے خبر دی ہو۔ مسلمان پر سب سے پہلے اپنے عقائد کی اصلاح لازمی ہے، اس کے بعد عمل صالح کی باری آتی ہے۔ کیونکہ اسلام کی مثال ایک عمارت کی طرح ہے۔ ایمان اس کی بنیاد ہے اور عمل صالح اس کا نمایاں حصہ، جس سے انسان استفادہ کرتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص نیک اعمال کرتا رہے، لیکن اس کا عقیدہ صحیح نہ ہو، تو اس کی مثال دلدلی یا ریتیلی زمین کے اوپر بلند و بالا عمارت تعمیر کرنے کی طرح ہے۔ یہ شخص اس عمارت پر جس قدر سرمایہ خرچ کرے گا، اتنا ہی اس کے لیے نقصاندہ ہوگا، کیونکہ بنیاد کچی ہونے کی وجہ سے کسی بھی وقت منہدم ہو کر مالک مکان اور اہل وعیال کو کچل سکتی ہے۔

یہی اس عمل صالح کی مثال ہے جس کی بنیاد صحیح عقیدے پر نہ ہو، وہ اللہ رب العزت کے ہاں مقبول نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی کا عقیدہ درست ہو لیکن اس کو عمل صالح کی توفیق نہ ملے، تو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جو مضبوطی کے ساتھ بنیاد بنانے کے بعد اس پر عمارت کھڑی نہیں کرتا، بیچارہ اس بنیاد سے کچھ بھی استفادہ نہیں کر سکتا۔ ایسا شخص معاشرے میں نہایت بیوقوف ہوتا ہے۔

فائدہ 12: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ.....﴾ سے عقائد کی اصلاح کے بعد عمل صالح کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اور عمل صالح کے معتبر ہونے کے لیے بنیادی طور پر دو شرطوں کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے:

(۱) عمل صرف اللہ کی رضا کے لیے خالص کرنا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ [الزمر ۲، ۳] ''اللہ کی عبادت اس کے لیے دین کو خالص کر کے انجام دو۔ خبردار! دین تو خالص اللہ پاک ہی کے لیے ہے۔'' حدیث قدسی میں فرمانِ الٰہی ہے: ''أنا أغنى الشركاء عن الشرك مَن عمل عملًا أشرَكَ فيهِ معي غيري تركتُهُ وشِركَهُ'' [مسلم ۷۴۷۵] ''میں تمام شرکاء سے بے نیاز ہوں، جو کوئی جس طرح کا بھی عمل کرے اور اس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں، مسترد کر دیتا ہوں۔''

(۲) عمل صالح کا نبی کریم ﷺ کی سنت مطہرہ کے مطابق ہونا بھی قبولیت کے لیے بالکل لازمی شرط ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ○﴾ [محمد ۳۳] ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔''